BA Part - III

Paper - VI

اردو تنقید پر ایک نظر

(پروفیسر کلیم الدین احمد)

سوال ۱: عبدالحق کی تنقید نگاری کے بارے میں کلیم الدین احمد کے خیالات قلمبند کیجیے یا عبدالحق کے تنقید نگاری کی حقیقی مقاصد کا جائزہ لیجیے۔

جواب: عبدالحق صاحب نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمت کی ہے۔ دراصل ان کی زندگی کا نصب العین اردو ادب کی خدمت رہا ہے۔ وہ محقق اور نقاد دونوں ہیں:

پروفیسر کلیم الدین احمد کا تاثر ہے کہ عبدالحق صاحب ایک پختہ کار محقق ہیں۔ وہ عجلت سے کام لیتے ہیں۔ محنت اور غور و فکر ان کی عادت ہے۔ وہ اپنے موضوعات پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ وہ جب تک بات کی تہ تک نہیں پہنچ جاتے ہیں رائے زنی نہیں کرتے ہیں۔ اپنے حدود کے اندر ذوق صحیح رکھتے ہیں۔ اچھے برے کو سے کھرے میں تمیز کر سکتے ہیں۔ وسعت نظر بھی موجود ہے۔ مغربی ادیبوں سے تو واقفیت نہیں لیکن مغربی اصول تحقیق سے واقفیت ہے۔ جزئیات سے کافی شغف ہے اور معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔

عبدالحق صاحب کی طرز تحقیق کا ایک نمونہ باغ و بہار ہے۔ یہ مشہور ہے کہ "باغ و بہار" قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ میر امن دہلوی بھی یہی کہتے ہیں لیکن عبدالحق صاحب نے ثابت کیا ہے کہ باغ و بہار فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قصہ وہی ہے مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے اردو کی کتاب "نو طرز مرصع" ہے۔ وہ رائے زنی نہیں کرتے بلکہ "چہار درویش" "نو طرز مرصع" اور "باغ و بہار" کا مقابلہ کرتے ہیں، جس سے ان کے قول کی پوری تصدیق ہو جاتی ہیں۔ جو ثبوت وہ پیش کرتے ہیں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن مثال کے لئے ملاحظہ ہو:

" اصل یہ ہے کہ ترجمہ ان دو میں سے کوئی بھی نہیں۔ فارسی قصہ کو اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں "نو طرز مرصع" اور فارسی کتاب میں اختلاف ہے۔ "باغ و بہار" میں "نو طرز مرصع" کا اتباع کیا ہے۔ اسی سے معلوم ہے کہ "باغ و بہار" جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے فارسی قصے کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ "نو طرز مرصع" ہے۔ بعض مقامات پر تو الفاظ اور جملے وہی لکھ دیئے ہیں جو "نو طرز مرصع" میں ہیں۔

اس طرح "نو طرز مرصع" اور "باغ و بہار" میں جہاں جہاں مشابہت ہے اس کو ظاہر کرتے ہیں پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "باغ و بہار" کا اصل ماخذ "نو طرز مرصع" ہے نہ کہ فارسی نسخہ۔ اس فیصلے سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔ پھر دونوں کتابوں کے طرز بیان کا مقابلہ کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ نو طرز مرصع کی عبارت نہایت رنگین اور سراپا تشبیہات و استعارات سے مملو ہے یہاں تک کہ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے جی متلانے لگتا ہے۔ عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

" زبان کا ڈھنگ پرانا ہے اور فارسی ترکیبوں اور الفاظ سے بھرپور..... اردو زبان کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس (باغ و بہار) سے لگا نہیں کھاتی..... مصنف کی زبان پر بڑی قدرت ہے اور وہ ہر موقع پر ان کے مناسب بہت الفاظ کا استعمال کرتا ہے اور ہر کیفیت اور واردات کا نقشہ اس خوبی کے ساتھ کھینچتا ہے کہ کمال انشا پردازی کی داد دینی پڑتی ہے"

اس نتیجے سے بھی اختلاف ممکن نہیں۔ عبدالحق صاحب جزئیات کی طرف بھی رجوع کرتے ہیں۔ بعض الفاظ کو گمنامی سے نکال کر کام میں لانے کا مشورہ دیتے ہیں اور الفاظ و محاورات، صرف و نحو میں جو تبدیلیاں ہوگئی ہیں ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔ الغرض عبدالحق صاحب نے مفید اور صحیح تحقیق کی عمدہ مثال پیش فرمائی ہے۔

محقق کی راہ میں ایک خطرناک مقام آتا ہے۔ اگر وہ ہوشیاری سے کام نہیں لیتا ہے تو اس مقام پر پھنس جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ محقق کامل محنت و جستجو، دماغ سوزی، صرفہ، وقت کے بعد کسی چیز کی تحقیق کرتا ہے۔ یا کم شدہ تصنیف کا سراغ لگاتا ہے۔ اپنی کامیابی سے خوش ہوتا ہے اور ایسا خوش ہوتا ہے کہ وقتی طور پر صحیح معیار تنقید کو بھول جاتا ہے۔ جس قدر اس نے محنت کی ہے، اسی قدر یہ چیز اسے عزیز اور قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ انسانی کمزوری سے بری نہیں۔ وہ مثنوی خواب و خیال پر لکھتے ہیں:

BA Part-III
Paper- VI

اردو تنقید پر ایک نظر

(پروفیسر کلیم الدین احمد)

"خواب و خیال ایک ایسی مثنوی ہے کہ ہماری زبان میں اس کا جواب نہیں۔ شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت اور شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور موقعوں کی برجستگی زبانے مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں، مثنوی خواب و خیال کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس مثنوی میں دل کی کیفیتوں اور معاملات عشقیہ کا بیان بہت قابل تعریف ہے اور خاص کر اس کا بے ساختہ پن اور بے تکلف طرز بیان بہت لائق داد ہے اور حق یہ ہے کہ کمال کو پہنچا دیا ہے۔ جہاں سے کتاب کھولیے ایک سی حالت ہے۔"

عبدالحق صاحب نے مثنوی کی خوبیوں کی طرف تو زیادہ توجہ فرمائی ہے اور خامیوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خوبیوں کی طرف ان کی توجہ زیادہ تھی یا پھر مبالغہ کے ساتھ خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ مثنوی خواب و خیال میں پر مسلسل قصہ ہے اور نہ ہی سیرت نگاری اس لحاظ سے دوسری مثنویوں کے مقابلے میں یہ بہت ہی کم مایہ ہے۔ اس مثنوی میں قوت تعمیر کا بھی کامل فقدان ہے لیکن اصل خامی دلچسپی کی کمی ہے اور اس خامی کا احساس عبدالحق صاحب کو نہیں ہو سکا۔ یہ مثنوی اتنی دلکش نہیں ہے کہ زیادہ دیر تک کسی محفل میں پڑھا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی طبیعت اکتانے لگتی ہے۔ دلچسپی کی کمی ادب میں اہم ترین خامی سمجھی جاتی ہے اور زبان کی سلاست، روانی، فصاحت اور شیرینی وغیرہ اس کی خامی کو دور نہیں کر سکتی ہیں۔

تنقید، تحقیق سے زیادہ قدر و قیمت کی چیز ہے۔ دیکھنے میں تحقیق کی راہ بظاہر بہت دشوار ہے۔ اس میں ایسی مشکلیں سامنے آتی ہیں جو بہت کٹھن ہوتی ہیں لیکن یہ مشکلیں محنت، صبر، دماغ، سوزی اور فرصت وقت عدم محلت سے آسان ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہیں۔ کم لوگ اس قسم کی محنت کی طاقت رکھتے ہیں اور راہ کو دشوار گذار سمجھ کر اس سے منھ موڑ لیتے ہیں۔ دوسری جانب تنقید کو راستہ ترقی سمجھا جاتا ہے۔ جو غیر ذمہ دار شخص آسانی سے کر سکتا ہے۔ اسی لیے لوگ اس طرح طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ اگر تنقید کے صحیح مفہوم سے واقفیت ہوتی تو کم لوگ اس طرف توجہ کرتے۔ تیز ادراک، زندہ احساس، عمیق دماغ، وسعت نظر جو دنیائے ادب، دنیائے علوم و فنون پر محیط ہو۔ مذاق صحیح ان سب اوصاف کی تنقید میں ضرورت ہے۔

تنقید کی عدم موجودگی میں تحقیق غیر مفید ہوتی ہے۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا مادہ بھی عبدالحق صاحب میں موجود ہے اور وہ اس سے موقعہ بھی لیتے ہیں۔ لیکن انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ اردو زبان میں تنقید کی کمی ہے۔ حالی نے جو تنقید کی داغ بیل ڈالی ہے اسے تکمیل تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

BA Part - III

Paper - VI

اردو تنقید پر ایک نظر

(پروفیسر کلیم الدین احمد)

سوال نمبر۲۔ ترقی پسند تحریک کے متعلق کلیم الدین احمد کے خیالات کی وضاحت کیجئے :

جواب : ترقی پسند تحریک کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کلیم الدین احمد نے بڑی تفصیل گفتگو کی ہے ان کے خیال میں ترقی پسند تحریک کے دو حصے ہیں۔ پہلی چیز تو وہ نظریات ہیں جن کی اشاعت ترقی پسند مصنفین کرتے ہیں اور دوسری جانب وہ ادب ہے جو ان اصول کے ماتحت لکھا جاتا ہے۔ یہ ادب تشفی بخش نہیں ہے۔ اس کی ناکامی کے دو اسباب ہیں۔ جن اصول پر ترقی پسند ادب کی بنیاد ہے وہ تمام اصول غلط ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عموماً ترقی پسند ادب میں ادبی محاسن نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ادب ادب نہیں ہے۔ بلکہ کوئی اور چیز ہے۔ اگرچہ خود ترقی پسند ادیبوں کو اس کی کمی کا احساس ہے لیکن وہ اس کمی کو دور نہیں کر سکتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی مفصل تنقید کے قبل ہم ترقی پسند مصنفین یا ان کے اقوال و خیالات پر نظر ڈالتے چلیں۔

پنڈت نہرو فرماتے ہیں :

" ایک بات سے جھلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے خاص خاص لفظ دہرانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے ایک زبردست خیال رکھ دیا۔ لیکن معقول لکھنے والے کے لئے یہ زیبا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات اور نہ کوئی خاص پیغام۔ ایسی چیزوں کی جگہ سیاست میں ہے "

یہ نہایت درست ہے کہ ترقی پسند ادب خیالی دنیا کی تنگ و دو تک محدود ہے۔ وہ تنقید ہو یا تخلیقی ادب ہر جگہ خاص خاص فقرے خاص خاص لفظ خاص خاص خیالات دہرائے جاتے ہیں اور ہر فقرے یہ لفظ اور یہ خیالات کا تکرار۔ ستعار خیالات کو نظم یا افسانے کے قالب میں ڈھال کر ترقی پسند لکھنے والے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انہوں نے کوئی زبردست ادبی خدمت انجام دی ہے۔ یا کوئی عظیم الشان ادبی کارنامہ پیش کیا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں :

غریبی کو مٹا دیں گے غریبی کو مٹا دیں گے
ہم اپنے بازوں کا زور دنیا کو دکھا دیں گے

ہوس کے آسماں پر ورش محلوں کو ہلا دیں گے
ہم انسانیت پر ظالموں کے سر جھکا دیں گے

یہ عزم قابل تعریف ضرور ہے لیکن اسے شاعری نہیں کہہ سکتے۔ غریبی کو مٹا دیں گے۔ یہ ایک نعرہ۔ اسے شاعری سمجھنا فہم پر دانستہ ظلم ہے۔ ایسی چیزوں کی جگہ سیاست میں معقول لکھنے والے کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ کسی سیاسی لیڈر کی طرح گرجنے لگے۔ غریبی کو مٹا دیں گے غریبی غریبی کو مٹا دیں گے۔ اس بیان میں نہ آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات، نہ کوئی پیغام۔ ترقی پسند ادب کا زیادہ سے زیادہ حصہ اسی قسم کا ہے۔ اس میں چند اشتراکی خیالات کی تکرار ہے اور بس ادب ادب باقی نہیں رہتا ہے۔ یہ تو محض پروپیگنڈا بن جاتا ہے۔

احمد علی صاحب کہتے ہیں :-

" ادب جان بوجھ کر پروپیگنڈا نہیں کرتا۔ کم از کم اچھے ادب کو جان بوجھ کر پروپیگنڈا نہیں کرنا چاہئے۔ میں اس کو ادب ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں جو ایک سیاسی لیڈر کی طرح کھڑا ہو کر دیوانہ وار چیخے کہ لوگو تم ننگے ہو تم پر ظلم ہو رہے ہیں اس لئے تم انقلاب کرو "

دراصل سیاست اور ادب الگ الگ چیزیں ہیں۔ ادب محض ایک آلہ نہیں جس سے سیاسی ترقی میں مدد لی جائے۔ ترقی پسند مصنفین کے سامنے ایک سیاسی منزل ہے اور وہ ادب کو بھی اور دوسرے ذرائع کی طرح اس سیاسی منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح وہ

BA Part-II
Paper-VI

اردو تنقید پر ایک نظر

(پروفیسر کلیم الدین احمد)

سیاسی محفلوں میں "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگائے جاتے ہیں اسی طرح زبان و قلم سے بھی اسی قسم کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ ان نعروں میں نہ کچھ الوکھی رنگ آمیزی ہوتی ہے اور نہ ادبی بلکہ اگر کچھ ہے تو دماغی اور جذباتی "کھوکھلاپن" ہے اور جہاں دماغی اور جذباتی کھوکھلاپن ہے تو وہاں ادب کا گزر نہیں ہو سکتا ہے۔ یا یونانی بین کی طرح ایک ہی دوا سے تمام امراض کا علاج ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مرحلہ درپیش ہوا، جہاں کوئی مسئلہ حل کرنا ہوا بس فوراً اشتراکیت کی گولی نکالی گئی۔ ہر مرحلہ یا مسئلہ معاشرتی ہو یا اقتصادی، سیاسی ہو یا ادبی، آسان ہو یا مشکل، سیدھا سادا ہو یا پیچیدہ سب کا حل صرف ایک ہے۔ اشتراکیت ہر مرض کی دوا ہے، نیم حکیم خطرۂ جان ثابت ہوں گے۔

ترقی پسند مصنفین کو غور و فکر کی فرصت نہیں ہے ان کے خیالات ماخوذ ہیں وہ دماغ سے صحیح صرف نہیں لیتے ہیں اور متعدد خیالات کی صحت و عدم صحت کے متعلق کبھی نہیں سوچتے ہیں۔

عبدالحق صاحب کہتے ہیں:

"مجھے معاف فرمائے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جو دل میں ہے وہ بیان میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں کہ عام فہم سے بالاتر ہیں۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا اور غالباً کوئی بھی اسے تسلیم نہیں کرے گا۔"

"ترقی پسند مصنفین" خیالات کو جو ان کے اپنے نہیں بلکہ مانگے ہوئے ہیں، بہت اہم سمجھتے ہیں اور الفاظ سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اگر کاریگر کا اوزار بھدا ہے تو اس کا کام بھی بھدا ہوگا۔ وہ لفظوں کے چناؤ میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہیں۔ وہ بغیر سمجھے بوجھے لفظوں کو کلام میں لاتے ہیں۔ کسی بات کو اچھے لفظوں میں کہنا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ الفاظ اور خیالات کے ناگزیر ربط سے بھی بیگانہ نظر آتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے اور نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو کہ لفظوں سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ وہ صاف اور گہرے خیالات کو بھی نہیں پا سکتا۔ وہ لفظوں کے خیال میں دماغی کاہلی اور جلد بازی کے مرتکب ہوتے ہیں اور خیالات بھی بے سوچے سمجھے اخذ کر لیتے ہیں۔ اسی لئے وہ ادیب نہیں بن پاتے۔ وہ انفرادی اسلوب بھی نہیں رکھتے۔ خیالات کی یکسانیت اسلوب کی یکسانیت کا سبب ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کے اشعار خشک اور بے مزہ ہوتے ہیں۔ وہ یہی یکسانیت کی وجہ سے طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔

بہرکیف ترقی پسند نقاد سماج اور اس کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ سماج ان کے ذہن میں کسی فوق الفطرت شئے سے کم نہیں اور وہ سماج اور فرد کے تعلقات سے صحیح طور پر آشنا نہیں۔ انسان نے مختلف وجوہ سے سماجی زندگی قبول کی اور معاشرتی زندگی کے فوائد حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنی فطری خواہشوں اور ضرورتوں کو مختلف معاشرتی قوانین کے ماتحت بنایا۔ لیکن اپنی انفرادیت سے یکسر دست بردار نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ منظم سوسائٹی کو دیکھنے سے اس کے افراد بظاہر مشینوں کی طرح یکساں نظر آئیں گے۔ لیکن کسی واقعہ، کسی تصادم سے یہ منظم چھلکا علیحدہ ہو جاتا ہے اور وہ ایک زندہ حساس، متلون انسان کی طرح عمل کرنے لگتے ہیں۔